



**DELHI UNIVERSITY
LIBRARY**

EPU

DELHI ~~UNIVERSITY~~ UNIVERSITY LIBRARY

Cl. No. A68

168 N41

Ac No E2919

Date of release for
29.11.1962

This book should be returned on or before the date last stated below. An overdue charge of 0.6 nP. will be charged for day the book is kept overtime.

فہرست

تعارُف (۱-۵)

- ۱۔ اُردو بحیثیت ذریعہ تعلیم ۱
- ۲۔ اُردو، ہندی، ہندستانی ۱۰
- ۳۔ اُردو دین ۲۹
- ۴۔ اردو زبان ۳۳
- ۵۔ سرِ تیج اور اُردو زبان ۳۵
- ۶۔ زبان اور قومی تعلیم ۴۷
- ۷۔ فرقہ وارانہ ذہنیت اور زبان ۵۷
- ۸۔ کشمیر اور اُردو زبان ۶۸
- ۹۔ پیام بموقع کل ہند اُردو کانفرنس۔ ۷۶
- ۱۰۔ اہل کشمیر سے سرسپر و کا خطاب ۸۵

تعارف

از جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکرٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)

اس مہینے (۸ دسمبر ۱۹۴۱ء کو) رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو نے اپنی عمر کی چھیا سٹھ منزلیں بخیر و خوبی طو کیں۔ سر تیج بہادر سپرو نہایت بے تعصب، بے لاک، اور سچے محب وطن، ہن۔ اس شور و شغب کے زمانے میں بھی جبکہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے رہنما جذبات کی زوینیں کہیں بکے کہیں نکل گئے تھے، اُن کے

(۱)

قدم نہیں ڈنگائے۔ وہ نہ کبھی حکومت سے اختلاف
 کرنے سے جھجکے اور نہ کبھی اپنے بزرگوں اور دوستوں
 سے سچی بات کہنے میں چو کے۔ وہ ہمیشہ اپنے اصول
 پر قائم رہے اور اگرچہ اس کی پاداش میں انھیں اپنے
 ہم وطنوں سے بہت کچھ بُرا بھلا سنا پڑا لیکن انھوں نے
 کبھی اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی آزادی رائے کو ہاتھ
 سے نہ دیا۔ اور بالآخر ان کے اکثر مخالفوں کو بھی ان
 کی اصابت رائے اور انصاف پسندی کا قائل ہونا پڑا۔
 وہ نہایت عالی ظرف، عالی خیال اور ہمدرد
 بزرگ ہیں۔ ان کے اخلاق کی طرح ان کی دوستی اور
 محبت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ہندو مسلمان سب
 سے یکساں محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں
 (ب)

اُذر نہایت کشادہ دلی سے ان کے کاموں میں مدد
دیتے ہیں۔

اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور بڑی بڑی کتابیں
پڑھتے رہتے ہیں۔ اُن کا کتب خانہ اُن کے ذوق
ادب اور شوقِ علم کا شاہد ہے۔ اہل علم اور ادیبوں اور
شاعروں کے بڑے قدردان اور سرپرست ہیں۔ میلوں
غریب طالب علم ان کی بدولت اپنی مُراد کو پہنچے
اور فارغ التحصیل ہوئے۔

وہ اُردو زبان کے بہت بڑے حامی ہیں اس
لیے کہ وہ اسے ہندوستانی تہذیب کا بہت بڑا جز
اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ اور مشترکہ کوشش کا بڑا
کارنامہ سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر انھوں نے
(بج)

انجمن ترقی اُردو (ہند) کی صدارت کو بخوشی قبول فرمایا
 اور اسے اپنے نیک مشوروں اور امداد سے سرفراز
 فرماتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو ہندوستانی تہذیب کا
 بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ سر تیج بہادر سپرو کو دیکھے۔
 ان کی علمی معاشرتی اور سیاسی خدمتوں کے متعلق کسی
 تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس سے ہمارے اہل
 ملک بخوبی واقف ہیں۔ ان شعبوں میں ان کی یہ
 سرگرمیاں اب بھی جاری ہیں۔ یونیورسٹیوں کے
 کانفرنسز، ایڈریسوں اور سیاسی تقریروں سے ان کے
 خیالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جتنے بندی اور فرقہ
 بازی کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور باہمی اتحاد کے
 بڑے حامی ہیں اور اس کو وہ ملک کی ترقی اور امن و
 (۵)

ان کی زندگی کے لیے سب سے مقدم خیال
کرتے ہیں۔

وہ اس عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ زندہ دل
اور خوش مزاج ہیں اور ان کے احباب ان کی پُر لطف
باتوں اور لطیفوں اور گوناگوں خیالات سے لطف
اٹھاتے ہیں۔

ہم خلوص دل سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ صحت و
وعافیت کے ساتھ ساہا سال زندہ و سلامت رہیں
اور اسی سزگرمی کے ساتھ ملک کی خدمت کرتے رہیں۔

اُردو بحیثیت ذریعہ تعلیم

[۷ نومبر ۱۹۲۵ء کو سر تیج بہادر سپرو نے

لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں

صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اردو زبان اور ذریعہ تعلیم

سے متعلق اقتباس درج ذیل ہے۔]

ہماری طرز تعلیم کا سب سے زیادہ اہم پہلو جو
موافق اور مخالف میں سے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا،
یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں بلکہ اسکولوں تک میں ذریعہ تعلیم
انگریزی زبان کو رکھا گیا ہے۔ اس پالیسی کے نتائج
بعض اعتبار سے نہایت افسوس ناک ثابت ہوئے۔

ہمارے بچوں کی بہت بڑی تعداد کی تعلیم میں یہ ایک بڑی رکاوٹ رہی کہ انھیں ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہو اور خصوصاً ایسے مضامین کی تعلیم جن کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اپنی زبان چھوڑ کر کسی اور زبان میں پڑھائے جائیں۔ یہ پالیسی سیمون

کا وہ طنز آمیز جواب یاد دلاتی ہو جو اس نے ایک ایسے شخص کو دیا تھا جس نے اپنے بچوں کی تعلیم کے متعلق مشورہ طلب کیا تھا اس نے کہا "انھیں وہ سب کچھ پڑھتے وجود وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے۔" مجھے مسرت ہو کہ ہم ان دنوں اس پالیسی کی غلطیوں کو سمجھ گئے ہیں مگر ہماری یونیورسٹیوں میں بہر حال اب بھی یہی پالیسی جاری ہو۔ بنارس اور علی گڑھ نے بھی، جن سے توقع تھی کہ اس

سلسلے میں ایک رہنمایانہ قدم اٹھائیں گی، اسی پُرلے ڈگر
 کو قائم رکھا۔ یہ کہا جاسکتا ہو کہ انھیں حالات نے مجبور
 کر دیا۔ مگر جامعہ عثمانیہ کی بنا ڈالنے والوں کی ہمت
 اور دُور اندیشی قابلِ صدداد ہو کہ اُنھوں نے یہ جان کر
 کہ ایک بلیسی زبان میں کتنی بھی دستگاہ حاصل کر لی جائے
 وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہتی ہو، شروع ہی سے یہ طر کر لیا کہ
 ذریعہ تعلیم اُردو کو بنایا جائے۔ ان لوگوں نے پچھلے چند سال
 کے اندر ہی کوئی ڈیڑھ سو اچھے معیار کی مختلف موضوعوں
 کی کتابیں اُردو میں ترجمہ کر لیں اور اب ترقی کے ایک
 نئے دور کی ابتدا ہمارے سامنے ہو۔ نیز یہ کہ جنوبی ہند
 میں ایک نہایت بھرپور اور مختلف قسم کا اُردو ادب
 نشوونما پا رہا ہو۔ اسی صوبے (متحدہ) کے ایک پروفیسر صاحب،

نے جنہیں ایک مشہور ولایتی یونیورسٹی میں تعلیم پانے کا شرف حاصل رہا ہے، کل ہی مجھ سے گفتگو میں کہا کہ عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک امتحان میں عمرانیات (Civics) کی کاپیاں انھوں نے جانچیں اور ان کاپیوں میں خیالات کی پختگی اور اظہار خیال کی خوش اسلوبی سے بہت متاثر ہوئے۔ نیز یہ کہ یہ چیزیں انھیں ایسے طلبہ کے جوابات میں کبھی نظر نہیں آئیں جو اظہار خیال انگریزی میں کرتے ہیں۔

سہارنپور کا یہ کہا جاتا ہے کہ ہماری یونیورسٹیاں سچ پوچھیے تو اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں سے ذرا بھی بہتر نہیں ہوتیں۔ مگر میں قیاس نہیں کر سکتا کہ ولایتی یونیورسٹیوں کا کیا حال ہوتا اگر انگریز بچوں کو تاراج، منطق و اخلاقیات

ادب کا اصول قانون کی تعلیم فرانسیسی، جرمن یا اطالوی زبان میں حاصل کرنا پڑتی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں میں انگریزی کا رواج بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ بلکہ اگر قومیت کے بے جا فخر یا تنگ نظرانہ قومیت کی بدولت کبھی ایسا وقت آیا کہ ہمارے بچے انگریزی ادب کی روحانی مسترتوں اور بلند خیالی سے محروم کر دیے گئے تو مجھ سے زیادہ شاید ہی کسی کو ہنس ہوگا کیونکہ انگریزی ادب کی بدولت ہمیں بہت سے نئے خیالات اور نئے معیار میسر آئے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں کسی عاجلانہ قدم اٹھانے سے پہلے محض عملی وجوہ ہی ہمیں متنبہ کر دینے کے لیے کافی ہوں گے۔ بعض مصناین یقینی ایسے ہیں کہ ان کی تعلیم ابھی ایک خاصے عرصے تک انگریزی زبان

(۶)

ہی میں ہونی چاہیے جب تک کہ ہماری زبان کی پہلی
مہم بہت کچھ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ میرا احتجاج انگریزی
کے استعمال یا انگریزی زبان کے مطالعہ کے خلاف
نہیں ہے بلکہ اس غفلت کے خلاف ہے جس کی بدولت
ہماری زبانیں پیچھے پڑ گئی ہیں۔

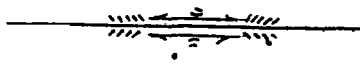
ایک ہندوستانی اپنی انگریزی زبان کی مہارت پر
جتنا چاہے فخر کرے مگر یہ سارا فخر ایک کمزور بنیاد پر ہو گا۔
اور اگر وہ خود اپنی زبان میں خوش اسلوبی اور وقار کے
ساتھ اچھے خیالات ادا نہیں کر سکتا تو اسے بعض اوقات
ذلت و شرم اور اپنی ذہنی اور ادبی فرومانگی ضرور محسوس
ہوگی۔ طلاقت اور خطابت کے وہ مظاہرے جو ہمارے
بعض آلِ مال۔ بنی ضلع کی عدالتوں میں اکثر پیش کرتے ہیں،

اساتذہ اُردو کو قبریں بے چین کر دیتے ہوں گے۔ جب ایک
 اچھے خاصے قابل اور لائق وکیل دورانِ بحث میں یہ کہتے
 ہیں کہ ”میں منٹیکل انٹار کرتا ہوں کہ ڈفنڈنٹ نے یہ دل
 ان ڈیو انفلوئنس سے اپنے حق میں کرائی“ تو ایسا معلوم
 ہوتا ہے کہ اُردو کا پاک صاف چشمہ یک بیک بالکل خشک
 ہو گیا ہے!

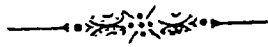
مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم اپنی وراثت کو جو
 بالکل ہماری اپنی ہے، ایک ایسے خزانے کی تلاش کے
 پیچھے جس کا ملنا کوئی آسان بات نہیں، سرعت کے ساتھ
 بھولتے اور ضائع کرتے جا رہے ہیں۔ تجربہ تو یہ بتاتا ہے
 کہ بلند پایہ ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں نے اعلیٰ خیالات
 اپنی ہی زبان میں ادا کیے ہیں۔ جان ملٹن اپنی پیریڈائز لاسٹ،

لاطینی زبان میں لکھ سکتا تھا۔ اس کے سوانح نگاروں کا بیان ہو کہ السنہ لاطینی اور یونانی میں اس کا علم اور مطالعہ بہت گہرا اور وسیع تھا۔ مگر اظہار خیال کے لیے اس نے اپنی ہی زبان منتخب کی۔ مائیکل ماد صو سودن دست اور رابندر ناتھ ٹیگور کا بنگالی زبان کو منتخب کرنا ایسی ہی دوسری مثالیں ہیں۔ لہذا لکھنؤ میں اور لکھنؤ یونیورسٹی کے اراکین کو مخاطب کرتے ہوئے مجھے امید ہو کہ مجھے معاف کیا جائے گا۔ اگر میں یہ یاد دلاؤں کہ اردو ادب کا ان پرچم خاص حق ہو۔ اس زبان کو حقیر نہ ہونے دیکھے جس زبان میں آتش، ناسخ، وزیر، رند، صبا اور دیا شکر نسیم شاہی کر گئے یا انیس اور دبیر نے مرثیہ لکھے ہیں۔ وہ زبان جس کے ذریعہ ابھی ایک نسل پہنے،

رتن ناتھ سرشار، شرر، سجاد حسین اور جوالا پرشاد برقی
 نے غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اس زبان کو محض اس
 لیے مٹنے یا بگڑنے نہ دیکھیے کہ مغرب کا تقاضا زیادہ شدید
 ہو یا مغرب کا پیام زیادہ سودمند ہو! اس زبان کی
 غور و پرداخت کیجیے اور اس کو ترقی دیجیے اور مجھے یقین
 ہو کہ جب آپ اُن بلند خیالات اور گہرے جذبات کی
 ترجمانی کا ارادہ کریں گے جو آپ کے دل و دماغ میں موجزن
 ہوں گے تو یہ زبان آپ کا ہر طرح ساتھ دے گی اور کبھی کمی
 نہ کرے گی۔ اسی طرح فارسی اور عربی سے بھی انماش نہ
 برتیے جو اردو کی تحصیل کے لیے ضروری ہیں اور جن کی تعلیم
 کے قدیم مرکز اب بھی یہاں موجود ہیں۔



اُردو، ہندی، ہندستانی



آج کل میں اکثر رسالوں ، اور اُردو کی تصنیفات میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ اُردو دکن میں پیدا ہوئی یا پنجاب میں یا کہیں اور۔ تاریخی نقطہ نظر سے اگرچہ یہ بحث ہنایت دل چسپ ہے لیکن زبان اور ادب کی ترقی پر مجھے اس کا اثر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ علمائے ادب کو اختیار ہے کہ اپنی تحقیقات سے اس کا مولد خواہ دکن قرار دیں خواہ دہلی مگر اس واقعے سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا

کہ اس ڈیڑھ دو سو برس کے عرصے میں جو کچھ ترقی اُردو
 زبان یا اُردو ادب میں ہوئی ہو وہ دہلی یا لکھنؤ میں
 ہوئی ہو، گو مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں
 کوئی عذر نہیں ہو کہ پچھلے بیس سال میں حیدرآباد
 نے اُردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ لیا ہو۔ پچیس
 برس پیشتر تک جب کوئی شخص اُردو کا تذکرہ کرتا تھا
 تو اس سے مراد زیادہ تر اُردو شاعری سے ہوتی تھی لیکن
 اس پچیس برس میں شاعری کے علاوہ اور اصناف میں
 بھی اُردو میں خاصی ترقی ہوئی ہو، اب کچھ کتابیں تاریخ
 یا فلسفے یا اور مضامین پر اُردو میں نکل گئی ہیں اور ان کو
 پڑھ کر اُردو کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہو، اسی طور
 پر ہمارے شاعروں کا بھی کچھ ڈھنگ بدل رہا ہو، پہلے

تو ان کو موئے میاں، چاہ زرخداں اور گل و بلبل
 وغیرہ کی بہت تلاش رہتی تھی اور اسی تلاش میں ان
 کی عمر صرف ہو جاتی تھی، لیکن اب شکر ہے کہ ہمارے
 شاعروں کی توجہ اور طرف بھی مبذول ہوئی ہے، ایران
 میں اس تیس چالیس برس کے اندر شاعری کا ڈھنگ
 بالکل بدل گیا، اور عصر جدید کے شعرا نے پرانی زنجیروں
 کو توڑ کر اپنے تخیل میں آزادی حاصل کر لی ہے، اپنے ملک
 کی اصلاح میں اور اپنے وطن کی حوصلہ افزائی میں جو
 ایران کے شعرا نے حصہ لیا ہے اس سے کسی شخص کو جو
 عصر جدید کی شاعری بے دافعت ہو انکار نہیں ہو سکتا،
 اگرچہ ابھی تک اردو شعرا پر تغزل کا رنگ بہت گہرا
 چرٹھا ہوا ہے لیکن بشدریج وہ بھی بدل رہے ہیں، غالب

نے ستر اسی برس پیشتر انہیں قیود کو محسوس کر کے غالباً
یہ شعر لکھا تھا :-

.....

کچھ اور چاہیے وسعت مری زبان کے لئے

اگر وسعت زبان کی ہماری طرف سے سمجھ بوجھ کے
کوشش کی گئی تو میرے خیال میں بین بچیس برس کے اندر
اُردو ادب میں کافی ذخیرہ پیدا ہو جائے گا جس کے
ذریعے سے ابتدا سے انتہا تک اسی زبان میں تعلیم دینا
ممکن ہو جائے گا۔ میرا عرصے سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی
ملک کی تعلیم غیر زبان میں نہیں ہو سکتی، نہ کوئی شخص غیر
زبان میں کمال حاصل کر سکتا ہی ملٹن کے بے شاعر نے جو
لاطینی زبان کا استاد تھا جب پراڈائز لاسٹ —

لکھنے کا ارادہ کیا تو آخر کار اس نے یہی تجویز کیا کہ
کہ اپنی ہی زبان یعنی انگریزی میں اسے نظم کرنا چاہیے
چنانچہ جو شہرت ملن کو اپنی زبان میں ”پراڈائز لاسٹ“
لکھنے کی وجہ سے ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

انگریزی تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تعداد تیس یا
پینتیس کروڑ آدمیوں میں صرف چند لاکھ کی ہے، لیکن
بڑے سے بڑے ہندوستانی کو ہر وقت یہ خوف رہتا
ہو کہ انگریزی بولنے یا لکھنے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔
ایسے شخص ہندوستانیوں میں جن کو انگریزی زبان پر
پوری قدرت حاصل ہو، یا جو محاورے اور ترتیب و
بندش الفاظ میں غلطی نہ کرتے ہوں، بہت کم ہیں اور
ہمیشہ کم نہیں گئے۔ ہر زبان کا تعلق سوسائٹی کے نظام

منے ہوتا ہے، جب ہمارا طرز و طریق زندگی ہندستانی
 ہو تو بہت سے الفاظ اور مجاورے انگریزی زبان
 کے ایسے ہیں جن کا اثر ہم پر دیا نہیں ہو سکتا جو
 انگریزوں پر ہوتا ہے، اسی طرح اگر بجائے انگریزی کے
 ہندستان میں فارسی یا عربی کا عام طور پر رواج ہوتا تو
 اس کا بھی دیا اثر ہندستانی طبیعت پر نہ ہوتا جیسا
 کہ ایرانیوں اور عربوں پر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا تجربہ
 ہندستان کو ہو چکا ہے۔

اسلامی عہد حکومت میں فارسی اور عربی کو بہت
 کچھ زور ہندستان میں رہا، لیکن ہندستانی مسلمانوں کو
 بھی بہ حیثیت زبان دانی کے کبھی وہ رتبہ حاصل نہیں
 ہوا جو ایرانی اور عرب ادیبوں کو ملتا ہے۔ ایک مرتبہ

اس مضمون پر منجھ سے پروفیسر برادون سے کیمبرج میں گفتگو ہوئی تھی، میں نے بہت دُرتے دُرتے ان سے یہ پوچھا کہ آپ کے تجربے میں ایران میں کس ہندستانی شاعر کی قدر کی گئی ہو، انھوں نے صرف خسرو کا نام بتایا اور اس پر بھی یہ کہا کہ گو خسرو ہندستانی تھے یعنی یہ کہ ہندستان میں رہے اور وہیں انھوں نے انتقال کیا لیکن بس اُن کی ہندستانی نہ تھی۔ مگر فارسی اور عربی کو چھوڑ کر جب سے اُردو کی بنیاد پڑی، ہندستانیوں نے جو اُردو میں کمال حاصل کیا ہو اُس پر کسی غیر ملک واسطے کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں ہو۔ تیز، سودا، ذوق، غالب و مومن، آتش و ناسخ، انیس و دبیر اُردو کے مالک تھے، انھوں نے جن ترکیبوں اور محاوروں کی بنیاد

ڈال دی خواہ وہ فارسی اور عربی کے لحاظ سے صحیح ہوں
یا غلط وہ اردو میں مروج ہو گئے، بہ حیثیت بانیان زبان
ان کے یہ بھی تھے کہ وہ جس طرح چاہتے اردو ترکیبوں کو
قائم کرتے، ان کی زبان نکسالی زبان ہو گئی۔ ان کے
معاورے یا ترکیبوں سے اختلاف کرنا یا تجاوز کرنا غلطی
میں شمار ہوتا ہو۔ اسی طریقے سے عصر موجودہ کے جو
اساتذہ ہیں ان کو بھی پورا اختیار ہو کہ نئے خیالات و
مفہومات کو مناسب طریقے سے اردو میں ادا کریں۔
ممکن ہو کہ بعض اوقات ان پر بھی نکتہ چینی ہوتی ہو مگر
رفتہ رفتہ ہم ان کی ایجادوں کے بھی عادی ہو جائیں گے
اور ان کی ترکیبیں بھی زبان میں داخل ہو جائیں گی۔
خلاصہ یہ ہو کہ اپنی زبان اپنی ملکیت ہو اس کو

جس طرح ہم چاہیں استعمال کر سکتے ہیں اور اس میں
 حسب ضرورت جو ترقی چاہیں کر سکتے ہیں، کسی شخص غیر
 کی رائے یا اجازت کے ہم محتاج نہیں۔ ہماری زبان
 ہمارے محسوسات و جذبات کی ترجمان ہے، جو نہ انگریزی
 ہو سکتی ہو اور نہ کوئی دوسری زبان۔ میں اسی وجہ سے
 ہمیشہ اس کا کوشاں رہا کہ اردو کی ترقی ہو، مگر میں اس سے
 ناواقف نہیں ہوں کہ جب اردو کا تذکرہ کیا جاتا ہو تو
 یہ سوال پیدا ہوتا ہو کہ ہندی کی کیوں نہ ترقی ہو؟ میں
 نہ ہندی کا بدخواہ ہوں اور نہ دشمن، گو اکثر ہندو اصحاب
 کا یہ خیال ہو کہ مجھ پر اردو یا فارسی کا اس قدر رنگ جما
 ہوا ہو کہ میں قریب قریب نیم مسلمان ہوں، میں نے
 نہ کبھی یہ کہا اور نہ اس کی کوشش کی کہ ہندی کی ترقی

نہ ہو مگر واقعہ یہ ہو کہ پانچ برس کی عمر سے جب کہ میری تعلیم شروع ہوئی ہو مجھے اُردو اور فارسی کا شوق رہا ہو اور اکثر انھیں کتابوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ اٹھاون برس کی عمر میں نئے نئے شوق و ذائقہ پیدا ہونے و شوار ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ شکایت ہو کہ میں نے ہندی اور سنسکرت کیوں نہیں پڑھی تو اس کا جواب وہ جہاں تک کہ میرے عالم طفولیت کا زمانہ ہو میں نہیں بلکہ میرے بزرگ ہو سکتے تھے۔ اور میرا خیال یہ ہو کہ میری عمر کے اکثر ہندوؤں کی یہی کیفیت ہو، پچاس برس پیشتر اس صوبے میں کم سے کم ان اطراف میں جہاں میں پیدا ہوا اور میری تعلیم ہوئی متوسط درجے کے ہندوؤں میں عام طور پر یہی رواج تھا کہ اُردو اور فارسی میں ان کی تعلیم شروع ہوتی تھی خواہ

اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اُردو اور فارسی زبان ذریعہ معاش تھی، خواہ کوئی اور وجہ ہو، لیکن واقعہ یہی ہو کہ دہلی میں جہاں میرے بزرگ رہتے تھے اور اس کے قرب و جوار میں جہاں میری تعلیم ہوئی یہی رواج تھا۔ اُسی رواج کے مطابق میری بھی تعلیم ہوئی مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ہندو ادب سے بالکل ناواقف ہوں یا میں نے وقفیت حاصل کرنے کی اپنے فرصت کے اوقات میں کوشش نہیں کی، میرا عقیدہ یہ ہو کہ کوئی ہندستانی اپنے تئیں ہندستانی کہنے کا مستحق نہیں ہوتا وقتیکہ وہ ہندو اور اسلامی تہذیب و ادب سے تھوڑی بہت واقفیت نہ رکھتا ہو۔ میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی اکثریت کو شکستہ کرتا ہوں کہ انہوں نے ہندو تائید کی اور ہندو تمدن سے

واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ ایک زمانے میں مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد مل سکتی تھی جنہوں نے ہندو ادب میں بھی ایک خاصہ درجہ پیدا کر لیا تھا۔ تھوڑے دنوں کی بات ہو ایک مسلمان نوجوان مجھ سے ملنے آئے انہوں نے تاریخ میں ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ یونان، روم اور یورپ کی تاریخ سے انہیں خاصی واقفیت تھی لیکن ہندو زمانے سے وہ بالکل ناواقف تھے اور اس کا انہوں نے اقبال بھی کیا۔ اسی طرح اکثر ہندو ایم۔ اے بھی ایسے ملیں گے جن کو اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن سے مطلق واقفیت نہیں۔

جب ایک معمولی تعلیم یافتہ ہندو کو یہ تعلیم دی گئی ہو کہ مسلمان ہندستان کو لوٹنے کے لیے آئے تھے، محمود

غزنوی نے سترہ حملے کیے، مسلمان بُت شکن تھے، انہوں نے آکر جابرانہ طور پر یہاں ۶۰۰ برس تک حکومت کی تو کسی کو کیوں تعجب ہو کہ وہ مسلمانوں سے دل میں نفرت رکھتا ہو، اسی طرح اگر کسی مسلمان بچے کو شروع سے یہ تعلیم دی جائے کہ ہندو جتنے ہیں سب بت پرست ہیں، اُن کے دینیات میں بجز تعصبات کے اور کچھ نہیں ہو، اور یہ مسلمانوں کے زیر حکومت ۶۰۰ برس تک رچکے ہیں اور اب مسلمانوں سے تاریخی انتقام لینا چاہتے ہیں تو کیا تعجب ہو اگر مسلمان ہندو سے نفرت کرے۔ اس چالیس برس کے اندر جس طرح کے بیج ہم نے بوئے ہیں اسی طرح کے درخت اور اسی طرح کے پھل ہمارے سامنے آ رہے ہیں۔ اور اس پر ہر شخص

کو دعویٰ نیشنلزم کا ہو۔

آج کل یہ تماشہ ہو رہا ہے کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقے میں کھانے پینے کی تو عام طور پر قیدیں اٹھ گئی ہیں، بلا تکلف ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ عام جلسوں میں یہاں، یا غیر ملکوں میں جب جاتے ہیں تو خورد و نوش جائز رکھتے ہیں مگر یہی حضرات جب سیاسی معاملات میں گفتگو یا تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے گویا کچھ واسطہ ہی نہ تھا اس سے بہتر تو ہمارے بزرگ تھے جو پابند قیود تھے لیکن چشم مروت رکھتے تھے، آپس میں دوستی اور اخلاص کا تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ بے اعتدالی اُس آزادی اور پولیٹیکل طاقت کا پیش خیمہ ہو جس کا ہم

سب دم بھرتے ہیں۔ جہاں اور نزاعات کی باتیں ہیں
 وہیں ایک زبان کا بھی مسئلہ ہو، اپنے دل کے پہلے نے
 کے لیے اب ہم نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ جب اردو
 اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہو تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں
 زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اردو اور ہندی
 کے لفظ ہندستانی استعمال کرنا چاہیے، ممکن ہے کہ چالیس
 یا پچاس برس پیشتر اس لفظ ہندستانی کا استعمال جائز
 ہوتا لیکن اس وقت تو میرے خیال میں اس لفظ کے
 استعمال سے یا تو اپنے دل کو پہلانا مقصود ہے یا ایک
 دوسرے کو دھوکہ دینا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت اردو
 اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں، اردو
 کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اردو میں فارسی

اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرا کر دیں،
 اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ
 ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ
 بھر دیئے جائیں۔ پس میرے لیے یہ مان لینا غیر ممکن ہو
 کہ ایسی اُردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندستانی کا لقب دے
 سکتے ہیں۔ مجھ کو تو اس کا خوف ہو کہ اگر یہی لیل و نہار
 رہے تو وہ زمانہ دُور نہیں جب کہ اُردو داں کو ہندی داں
 سے گفتگو کے وقت ایک ترجمان کی ضرورت ہوگی اور
 اسی طرح اس کا برعکس۔ اگر واقعی ہم لوگوں نے یہ طو کر لیا
 ہو کہ اسی طریقے سے اُردو اور ہندی کی علیحدہ علیحدہ ترقی
 ہو اور جو کچھ نتائج ہوں برداشت کریں تو کیوں نہ جرات
 کرنے ساتھ ہم اس کو مان لیں کہ اُردو دانوں کو اُردو

اڑتیس برس کے تجربے میں کبھی نہیں سُنے تھے۔ آخر کار
جب اُس کا ترجمہ انگریزی میں میرے سامنے پیش
کیا گیا اُس وقت میں قانونی رائے دے سکا۔ اب یہی
دستاویز کو میں کیا کہوں، 'اُردو' ہندی یا ہندستانی؟۔
میں اگرچہ سیاسی معاملات کے متعلق بہت کم
عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن جو کچھ میں نے اوپر اشارہ
کیا ہے وہ محض اس وجہ سے کہ زبان کا بہت کچھ تعلق
سیاسی نظام سے ہوتا ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں
مثلاً پولینڈ یا السیس لورین میں جو زبان کے متعلق
آپس میں جھگڑے ہوئے ہیں اور ان سے جو نتائج
پیدا ہوئے اُن سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔
گودہاں تو یہ تھا کہ فاتح اور مفتوح کے درمیان

کی ترقی کا استحقاق حاصل ہو اور ہندی دانوں کو ہندی کی ترقی کا میرے خیال میں اگرچہ یہ بہتر ہوتا کہ ہندستانی یعنی ایسی مشترکہ زبان جس کو عام طور پر ہندو اور مسلمان سمجھ جاتے رائج ہوتی، لیکن اب اگر یہ ناممکن ہو گیا ہو تو ہم کم از کم یہ کر سکتے ہیں کہ غیر مانوس عربی اور فارسی کے الفاظ اُردو سے اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ ہندی سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصہ ہوا کہ ایک وصیت ایک ہندو صاحب نے ایک وکیل صاحب کی معرفت میرے پاس بھیجی۔ میں نے اسے دو مرتبہ سنا، ہندی میں لکھی ہوئی تھی۔ سترنی صدی الفاظ میں نہیں سمجھ سکا۔ ایسے ایسے قانونی الفاظ سنسکرت کے اس میں لکھے گئے تھے جو میں نے اپنے

تنازعے تھے، یہاں یہ کیفیت ہو کہ یہ جھگڑے فاتح اور
مفتوح کے درمیان نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے
باشندوں میں، اور اس پر لطف یہ کہ دونوں خواہان
آزادی ہیں۔

میں نے رداروی میں اپنے مکرم دوست مولوی
آصف صاحب مدیر رسالہ ہندستانی کی فرمائش اور تقاضے
کی وجہ سے اپنے چند خیالات کا غیر مسلسل طور پر اظہار
کیا ہو، ممکن ہو کہ بعض اصحاب کو میرے خیالات سے
اختلاف ہو، مگر میں انھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے
یہ خیالات مخلصانہ ہیں۔

(رسالہ ”ہندستانی“ جولائی ۱۹۳۲ء)



اُردو دن

[انجمن بہار ادب لکھنؤ کی درخواست پر ہندستان کے مختلف حصوں میں ۸ اردو سہ ہفت روزہ کو اُردو دن بڑی کامیابی سے منایا گیا۔ کلکتہ، بمبئی، لاہور، دہلی، سری نگر، پشاور، راولپنڈی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ اور الہ آباد کے علاوہ ہندستان کے بہت سے دوسرے شہروں اور قصبوں تک میں جلسے ہوئے جن میں اُردو کے نام لیوا ہندو مسلمان سب شریک رہے۔ لاہور کا جلسہ ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر (پنجاب یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوا، دہلی کے جلسے کی صدارت جناب بشیشور ناتھ صاحب منوڑ نے کی، علی گڑھ میں جناب

تنازعے تھے، یہاں یہ کیفیت ہو کہ یہ جھگڑے فاتح اور
مفتوح کے درمیان نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے
باشندوں میں، اور اس پر لطف یہ کہ دونوں خواہان
آزادی ہیں۔

میں نے رداروی میں اپنے مکرم دوست مولوی
آصف صاحب مدیر رسالہ ہندستانی کی فرمائش اور تقاضے
کی وجہ سے اپنے چند خیالات کا غیر مسلسل طور پر اظہار
کیا ہو، ممکن ہو کہ بعض اصحاب کو میرے خیالات سے
اختلاف ہو، مگر میں انہیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے
یہ خیالات مخلصانہ ہیں۔

(رسالہ ”ہندستانی“ جولائی ۱۹۳۲ء)



اُردو دن

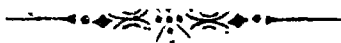
[انجمن بہار ادب لکھنؤ کی درخواست پر ہندستان کے مختلف حصوں میں ۱۸ دسمبر ۱۹۳۷ء کو اُردو دن بڑی کامیابی سے منایا گیا۔ کلکتہ، بمبئی، لاہور، دہلی، سری نگر، پشاور، راولپنڈی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ اور الہ آباد کے علاوہ ہندستان کے بہت سے دوسرے شہروں اور قصبوں تک میں جلسے ہوئے جن میں اُردو کے نام لیوا ہندو مسلمان سب شریک رہے۔ لاہور کا جلسہ ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر (پنجاب یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوا، دہلی کے جلسے کی صدارت جناب بشیشور ناتھ صاحب منوڑ نے کی، علی گڑھ میں جناب

آنڈسروپ صاحب بھل، لکھنؤ میں جناب کرشن
پرشاد صاحب کوئل اور آگرہ میں پنڈت راج ناتھ جٹا
کنزرو نے جلسوں کی صدارت کی۔ الہ آباد کے ایک
جلسہ کی صدارت رائے بہادر آر۔ بی جینی نے کی
اور ایک جلسہ کی صدارت سر تیج بہادر پر و نے فرمائی۔
موصوف کی صدارتی تقریر کا ایک اقتباس درج
ذیل ہے۔

اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباد
اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے
ملی ہو جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہو اور یہی ذہ زبان ہو جو
قریب قریب ہر صوبے میں کم و بیش بولی اور سمجھی
جاتی ہو مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس ۔

پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہو کہ عوام غیر فطری طور پر ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنا کوئی اختیار کر لیں جو فطری طور پر ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہو اور ان کی آپس کی رواداریوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہو۔ اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہو، مٹائی نہیں جاسکتی۔ اگر چند مٹھی بھر آدمی فرقہ دارانہ سوال پیدا کر کے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ سودائے خام ہو۔ اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہو تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی..... بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو دیہاتوں میں عام طور پر بولی اور

سمجھی جاتی ہو لیکن جب کہ ہر گاؤں اور قصبے کی مقامی
 بولی اور لب دہجہ میں فرق ہو اور اس طرح دیہاتی اور
 شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہو تو آپ کہاں
 تک ان کی تقلید کریں گے۔



اُردو زبان

(ایک عقیدہ)

"مجھے اُردو زبان سے محبت ہے۔ میں اس کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور اپنے ہندستان کی زبان! مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ اُردو میری مادری اور قومی زبان ہے۔ میں اس کا کبھی قائل نہیں ہو سکتا کہ اُردو مسلمانوں کی زبان ہے بلکہ جتنا دعویٰ مسلمانوں کو اُردو پر ہو سکتا ہے اتنا ہی ہندوؤں کو بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اُردو دراصل ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی اور اس اتحاد کی واحد یادگار ہے۔ میں اُردو

میں عربی، فارسی کے مشکل الفاظ کو داخل کرنے اور بلاوجہ
اُردو کو مشکل بنانے کا مخالف ہوں اور اسی طرح منسکرت
الفاظ کے ٹھونسے جانے کا موید نہیں ۛ

ۛ ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں "یوم چکبست"

سر تیج بہادر سپہر کی زیر صدارت منایا گیا۔ اُس موقع پر جو مضمون
اور نظمیں پڑھی گئی تھیں اُن کا مجموعہ یاد چکبست کے نام سے شائع

کیا گیا ہے۔ اس کا دیباچہ "عرض حال" کے عنوان سے پنڈت

برج کشن ٹوپا نے لکھا ہے۔ اس دیباچے سے سر سپہر کی تقریر کا

یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

سرتیج اور اردو زبان

[رسالہ بہار کشمیر، لاہور کا ایک خاص نمبر "پگہست" کے نام سے فروری ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا۔ اس میں سرتیج بہادر سپرو کا یہ مضمون بھی شامل ہے۔]

ای رہ تو رو عالم بالا چگونہ
 مابے تو درہیم تو بے ماچگونہ
 ایڈیٹر صاحب "بہار کشمیر" کے ارشاد کی تعمیل
 مجھ پر واجب ہے۔ میں اس وجہ سے چند منتشر خیالات
 ضبط تحریر میں لا کر بھیج رہا ہوں۔ فارسی اور اردو کی
 کتابوں کے مطالعے کا مجھے شوق رہا ہے لیکن نہ میں

عالم ہوں اور نہ ادیب ہوں۔ اور میں ہرگز اس کا
 دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں کسی شخص کی شاعری پر نائے زنی
 کروں یا اس پر تبصرہ لکھوں۔ البتہ میں خوش ہوں کہ
 کہ پنڈت برج نرائن چک بستی کی وفات کے بعد اس
 وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن کی زندگی علمی مشاغل و
 کلام کے متعلق اُن کے مدح اور قدردان اپنا خراج تحسین
 اُن کی یادگار میں پیش کریں۔

۔۔۔ پنڈت براج نرائن چک بستی مرحوم مجھ سے عمر
 میں چھوٹے تھے لیکن اُن کے اور میرے درمیان بزرگی
 اور خوردی کا تعلق نہ تھا بلکہ برابری کا تھا۔ حالانکہ وہ
 ۔۔۔ پُرانی تہذیب کے مطابق بذات خود مجھ سے ویسا ہی
 برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ کچھ عرصے قبل چھوٹے بڑوں

سے کرتے تھے۔ ایک رشتہ اتحادِ باہمی یہ تھا کہ اُن کو بھی اُسی نادر الوجود ہستی سے عقیدت تھی کہ جس سے مجھ کو بھی تھی۔ میرا اشارہ پنڈت بشن نرائن در مرحوم کی طرف ہے۔ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا کہ جب پنڈت بشن نرائن در لکھنؤ سے ولایت بغرض تعلیم تشریف لے گئے اور مجھے خواب یاد ہے کہ کشمیری پنڈتوں میں اُس وقت کیسا غل و غوغا ہوا۔ برادری دو ٹکڑوں میں منقسم ہو گئی، باہمی تعلقات میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مگر میں ان باتوں کا تذکرہ اس وقت فضول سمجھتا ہوں۔ اس بچپن برس کے اندر کشمیری پنڈتوں کے طرز و طریق زندگی میں و خیالات میں قریب قریب ہر جگہ ایسا انقلاب عظیم پیدا ہو گیا ہے کہ اگر پچاس برس پیشتر کے بزرگ اس

وقت دوبارہ پیدا ہو جائیں تو وہ اپنی اولاد کو پہچان نہ سکیں گے۔ پنڈت بشن نرائن کا اثر اس صوبے میں کشمیر پر ایک ہی محدود نہ تھا بلکہ میرے زمانے کے ہر طبقے کے طالب علموں اور نوجوانوں پر بھی اُن کا بہت بڑا اثر پڑا۔ پنڈت بشن نرائن صاحب کی علمیت اور انشا پر داری اور شوق تحصیل کا اندازہ آج کل کے نوجوانوں کو نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارے صوبے میں پچاس برس پیشتر کسی نے آزادی خیال و تحصیل علم کی بنیاد ڈالی تو پنڈت بشن نرائن درہی نے ڈالی۔ مجھ کو اُن کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علاوہ اس کے کچھ اُن سے قرابت بھی تھی۔ میں اُن کو استاد، ہادی اور رہنما سمجھتا تھا۔ اُن کی صحبت میں بیٹھنا میں عین سعادت سمجھتا تھا۔

پنڈت بشن نرائن صرف انگریزی کے جید عالم نہ تھے بلکہ فارسی اور اردو میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ اور جہاں اُنھوں نے اپنے سمعصروں میں اور شوق پیدا کیے وہاں فارسی اور اردو کے شوق کو بھی اُنھوں نے بڑھایا۔ مجھے یاد ہو کہ ایک دفعہ اُنھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ تم جتنی چاہے زبانیں پڑھو مگر اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے بے وفائی نہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پنڈت راج نرائن چک بست کے خیالات میں سختگی اور بلندی اس قدر جلد پیدا ہوتی تو اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ اُن کی علمی اور اخلاقی زندگی پنڈت بشن نرائن صاحب در کی ذات بابرکات سے وابستہ تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی ایک نظم میں

اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔
 کیا زمانے میں کھلے بے خبری کا مری راز
 طاہر فکر میں پیدا تو ہو اتنی پرواز
 کیوں طبیعت کو نہ ہو بے خودی شوق پہ ناز
 حضرت آبر کے قدموں پہ ہے یہ فرق نیاز
 فخر ہے مجھ کو اسی در سے شرف پانے کا
 نہیں شرابی ہوں اسی رند کے مرغ خانے کا
 پنڈت دیا شکر نسیم کے بعد اگر کشمیری پنڈتوں میں
 کوئی شخص ہوا ہے کہ جس نے اُردو میں ویسا ہی کمال
 حاصل کیا تو وہ برج نرائن چک بستی تھا۔ براج نرائن
 چک بستی کی شہرت اس وقت ہندستان میں ایک طرف
 سے دوسری طرف تک پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی حلقہ

اُردو دانوں کا نہیں ہوگا جہاں برج نرائن چک بست
 کا نام عزت اور احترام سے نہیں لیا جاتا۔ پچھلے سال
 یں لکھنؤ کی "بزم بہار ادب" کے جلسے میں شریک تھا
 وہاں صرف ہندو شعرا ہی نے نہیں بلکہ مسلمان اساتذہ
 نے بھی بلا تکلف اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ اُن
 کے کلام کی تعریف کی اور تعریف ہی نہیں کی بلکہ لکھنؤ
 کے بہترین زبان دانوں میں اُن کا شمار کیا۔ شاید میرے
 لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت پنڈت برج نرائن
 چک بست کی شہرت نسیم سے بہت زیادہ ہے اور اس کی وجہ
 میری دانست میں یہ ہے کہ اب لوگوں کا مذاق بدل گیا ہے۔
 انہوں نے دماغ کہ پُرسد ز باغباں
 بے گیت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اُردو شاعری کے کئی دؤر ہوتے ہیں۔ اس میں کلام
 نہیں کہ اُردو شاعری پر فارسی شعرا کا بہت بڑا اثر پڑا
 ہے۔ گل و بلبل کے قصوں میں اُردو شعرا ہمیشہ مبتلا
 رہے ہیں۔ لیکن آج کل جیسا میں نے اوپر عرض کیا
 ہمارا مذاق بدل گیا ہے۔ حالانکہ اس وقت بھی غزل گوئی
 کا شوق قائم ہے اور اس صنف میں بڑے باکمال شعرا
 موجود ہیں لیکن اب ایک دوسرا دھارا بہ رہا ہے۔ فی زمانہ
 نظم کا شوق ترقی پذیر ہے۔ تبدیلی مذاق کے مختلف اسباب
 ہیں۔ مغربی تعلیم کا ہمارے خیالات پر عظیم الشان اثر
 پڑا ہے۔ آزادی کے نعرے ہر طرف لگ رہے ہیں۔
 وطن پرستی کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت
 میں یہ غیر ممکن تھا کہ اس عصر جدید کے شعرا پر ان

تمام باتوں کا اثر نہ پڑے۔ چنانچہ پنڈت برج نرائن پر بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ حالانکہ پنڈت صاحب مرحوم نے غزل گوئی میں بھی اپنی نازک خیالی اور زبان دانی کا سکہ جما دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ نظم میں انھوں نے خاص طور پر کمال حاصل کیا۔ ان کے طرز بیان پر جیسا کہ ایک مضمون سابق میں لکھا تھا لکھنؤ کی ٹکسالی زبان کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آتش وانیس و دبیر کے رنگ میں ان کی زبان ڈوبی ہوئی ہے اور اسی زبان میں انھوں نے قلبی وارداتوں کو ادا کیا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ چند نکتہ چینیوں اور حرفیوں نے ان کی زبان پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن منصف مزاج شخصوں کو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی زبان لکھنؤ کے بہترین طبقہ

کی زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان دانی سے قطع نظر کر کے میرا یقین ہے کہ چک بست کے کلام میں جو درد ہے وہ بہت کم اُن کے ہم عصر شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود کہا ہے۔

جو خود نہیں سرگرم کرے گا وہ بشر کیا

جب دل میں نہیں دردِ زباں میں ہوا اثر کیا
ان کی زبان دانی اور شاعری کے متعلق میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اس دیباچہ میں جو کہ قریب بارہ برس ہوئے لکھا تھا یہ عرض کیا تھا کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا اور اُردو شاعری مصنوعی قیود سے آزاد ہوتی جائے گی اور آزادی کی فضا میں اس کو نشو و نما پانے کا موقع ملے گا بریج نرائن کی شہرت بتدریج بڑھتی جائے گی

اور آئندہ نسلیں اس امر کو تسلیم کریں گی کہ وہ دؤر جدید کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ اب نہیں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن کی وفات کے بعد ان اطراف میں تو یہ دعویٰ بدرجہ ثبوت پہنچ گیا ہے۔

اگر شعر گوئی میں برج نرائن چمک بست نے ایسا کمال حاصل کیا جو ہمارے لیے مایہ ناز ہے تو ان کی زندگی بھی ایسی جیتی جاگتی مثالِ راست بازی، بلند خیالی، وطن پرستی، وفا شعارِ اور نیک چلنی کی تھی کہ جس کا اندازہ صرف انھیں کو ہو سکتا ہے جو اُن کے زیر اثر تھے۔ ایسی ہستیاں زمانے میں بہت کم ہوتی ہیں اور جو لوگ اُن کے ہم عصر رہ چکے ہیں اور اُن وقت بقید حیات ہیں اُن کے لیے یہ خیال =

کرنا ہی کہ وہ ایک زمانے میں اُن کے ہمصر تھے
 اور اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوتے تھے،
 باعث فخر ہے۔



زبان اور قومی تعلیم

[جامعہ عثمانیہ کے جلسہ تقسیم اسناد (۱۹۳۹ء) میں
رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر سرتاج بہادر سپرو، پی۔ سی،
کے سی۔ ایس۔ آئی، ایم۔ اے، ال۔ ال۔ ڈی
(الہ آباد) ڈی۔ سی۔ ال (آکسفورڈ) ڈی لٹ (بنارس)
ال۔ ال۔ ڈی (عثمانیہ) نے صدارت فرمائی تھی۔
صدارتی خطبہ کے کچھ اقتباس درج ذیل
ہیں۔]

تقریباً پندرہ سال کی بات ہو کہ مجھ سے لکھنؤ میں ایسی
قسم کا خطبہ دینے کی خواہش کی گئی تھی۔ اس موقع پر
میں نے آپ کی جامعہ کو جو اُس وقت زندگی کی ابتدائی
منزلوں ہی میں تھی اس کی اُس جرات اور ہمت پر

مبارک باد دی تھی جس کا ثبوت آپ نے ایک ہندستانی زبان کو ذریعہ تعلیم بنا کر دیا تھا اس کے بعد سے مجھے اس مسئلے پر مزید غور کرنے کا موقع ملا ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جاتا ہے میرا یہ یقین پختہ ہوتا جاتا ہے کہ کسی غیر زبان کے ذریعے ایک پوری قوم کو تعلیم دینا ناممکن ہے۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر کوئی شخص ایک یا ایک سے زیادہ غیر ملکی زبانیں اچھی طرح جانتا ہو تو اس کا لطف زندگی دو بالا اور اس کی نظر وسیع ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرا دعویٰ ہے کہ ہم اپنے نوجوان مردوں اور عورتوں کو کسی بڑے پیمانے پر غیر زبان کے ذریعے تعلیم دے کر وہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے جن کی توقع ہمیں کسی ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے سے

ہو سکتی ہو۔ میں ان بعض نازک مزاج حضرات
 کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتا جن کی قومیت
 کا تخیل کسی خاص ہندستانی زبان کے ساتھ
 وابستہ ہو۔ میرے لیے صرف یہ مان لینا کافی ہو
 کہ اُردو سرتاپا ایک ہندستانی زبان ہو جو دکن
 میں پیدا ہوئی، دلی میں اس نے نیا جنم لیا اور
 اس کی اُنٹھان اور ترقی میں شمالی ہندستان
 اور خود آپ کے حصہ ملک یعنی دکن نے
 قابلِ قدر حصہ لیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہو کہ میں
 آپ کے حصہ ملک کی دوسری زبانوں کو نظر انداز
 کرتا ہوں یا ان کی ناقدری کرتا ہوں بلکہ مجھے تو یہ معلوم
 کر کے خوشی ہوتی ہو کہ دوسری ہندستانی زبانوں کا

ممنوع کرنا تو درکنار، آپ کی جامعہ نے ان کی تعلیم کا انتظام کیا ہے۔ اُردو زبان کو میں جو اہمیت دیتا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ گزشتہ زمانے میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تہذیبی تعلق اور میل جول کا ایک زبردست رشتہ اتحاد رہ چکی ہے اور یہ کام وہ آج بھی کر سکتی ہے اور ہندوستان کے اکثر حصوں میں کر رہی ہے۔ انسانی تجربہ شاہد ہے اور کم از کم ہمارا تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ اگر ایک طرف مذہب اور سیاسیات، سماج کو گروہوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اختلاف رائے کو تیز اور تلخ کر دیتے ہیں تو دوسری طرف ایک مشترکہ تہذیب کی پیروی سے ہمارے دل ملتے اور آپس کی یہ تلخیاں

ہلکی ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ تجربہ ہے جو آپ اپنی جامعہ میں
 کمر رہے ہیں اور باوجود اس اختلاف رائے کے جو اس
 مسئلے پر ہو رہا ہے میری دل چسپی اس کے ساتھ اسی
 طرح برقرار ہے اور سچ پوچھیے تو اختلاف رائے سے
 مفربھی نہیں ہے۔ نکتہ چینی بے شک فائدے کی چیز ہے
 بشرطیکہ وہ صحیح اور سچی ہو، لیکن اگر اس سے رایوں میں
 گمراہی اور مقصد میں جھجھو راہن پیدا ہو جائے تو اس کا
 مدعا فوت ہو جاتا ہے۔

آپ کی جامعہ کی ایک خصوصیت جس نے مجھے
 خاص طور پر متاثر کیا وہ بحیثیت جامعہ کے ایک ضروری
 جز کے سررشتہ ترجمہ و تالیف کا قیام ہے۔ تاریخ قدیم
 و جدید، سیاسیات، دستور انگلستان، معاشیات، فلسفہ

مابعد الطبیعیات، اخلاقیات اور سائنس کی جن کتابوں کو آپ نے ترجمہ کر کے شائع کیا ہو ان کی فہرست کسی طرح بھی ناقابل لحاظ نہیں کہی جاسکتی اور مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہو کہ اس کام کے متعلق جو نظام عمل آپ کے پیش نظر ہو وہ مکمل ہو جانے پر ہمارے ذہن اور تہذیبی سرمایہ میں اہم اضافہ کرے گا۔ آج کل جو حالات ہیں ان میں ہمیں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم غیر ملکوں کی کتابیں ترجمہ کر کے اپنے تہذیبی اور ادبی سرمایہ کے اضافہ پر کافی توجہ صرف کریں۔ اگر ملک کے نوجوانوں کو آئندہ ہندوستانی زبانوں ہی میں تعلیم دینا ہو تو خود اپنی زبانوں میں کافی، مناسب دروز الخردوں ذخیرہ ادبیات کے پیدا کرنے کی

ساری ذمہ داری ہماری یونیورسٹیوں پر ہو اور وہ کسی طرح اس سے پہلو ہتی نہیں کر سکتیں پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں "عربوں کے علم و فضل کے خزانے مغرب میں منتقل کرنے کا خاص واسطہ طلیطلہ (TOLEDO) تھا جو ۸۵۰ء میں یعنی مسیحی فتح کے بعد بھی اسلامی علم و فضل کا باعث بنا رہا یہیں اسقف اعظم ریمینڈ اول (۱۱۲۶ء - ۱۱۵۱ء) کی کوشش سے ترجمہ کا ایک باضابطہ ادارہ قائم ہوا جس میں ۱۱۳۵ء اور ۱۲۸۴ء کے درمیان کئی مترجمین پیدا ہوئے یورپ کے دور دراز حصوں سے علم کے شوقین یہاں کھینچے چلے آتے تھے، ان میں انگلستان کے لوگ مثلاً مائیکل اسکاٹ (Michael Scott) اور رابرٹ آف چسٹر (Robert of Chester) بھی تھے ۱۲۵۰ء میں

رابرٹ نے الخوارزمی کے جبر و مقابلہ کا پہلا ترجمہ کیا۔
 اسی شخص نے ۱۱۴۳ء میں مقدس پیٹر (Peter the Venerable) کے لیے ڈالمیشیا کے باشندے ہرمان
 (Hermann) کے ساتھ مل کر لاطینی زبان میں قرآن شریف
 کا پہلا ترجمہ تیار کر لیا تھا۔ خود ہماری تاریخ بھی اس قسم
 کی متعدد مثالیں پیش کر سکتی ہو۔ غالباً آپ کے سامنے
 عہد مغلیہ کے ان علما کے نام گنانے کی چنداں ضرورت
 نہیں ہو جنہوں نے سنسکرت یا اور دوسری ہندوستانی
 زبانوں کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے۔ خود انگریزی
 عہد کے ابتدائی زمانے میں ہماری زبانوں کے بہت
 کچھ ترجمے انگریزی میں کیے گئے لیکن زمانہ بدل گیا ہو
 اور اب ہمیں اس کی ضرورت آن پڑی ہو کہ ہم غیر زبانوں

کی کتابوں کا ترجمہ اپنی زبانوں میں کریں۔ اسی لیے میں
 آپ کی جامعہ کے اس کام کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔ میں
 بلاتامل یہ کہنے پر آمادہ ہوں کہ آپ کے زیر اہتمام اردو میں
 جو کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں ان میں نے ان میں سے کئی کتابیں
 پڑھی ہیں اور بحر ایک اعتراض کے جو میں بہت صاف
 دلی کے ساتھ ابھی کروں گا، ان کتابوں سے صرف میری
 دل چسپی ہی نہیں ہوئی بلکہ میں نے آپ کے ترجموں سے
 بہت کچھ استفادہ بھی کیا ہے۔ مجھے جو اعتراض ہو وہ یہ ہے
 کہ اکثر مجھے یہ خیال ہوا ہے کہ آپ کے دارالترجمہ کی طرف
 سے جو کتابیں شایع ہوتی ہیں ان میں عربی اور فارسی کے
 مشکل لفظوں کے استعمال کا کھلا ہوا رجحان پایا جاتا ہے۔
 براہ کرم میری طرف سے کسی غلط فہمی کو اپنے دل میں
 راہ نہ دیجیے۔ میں مانتا ہوں کہ فنی اصطلاحیں اور جملے

ترجمہ کرتے وقت یا عوام کے روزمرہ کی بجائے تہذیب
 کی زبان میں کچھ لکھتے وقت، عربی اور فارسی کے ذخروں
 سے کام لیے بغیر چارہ نہیں، تاہم اس بات پر زور دینا
 چاہتا ہوں کہ اگر آپ اردو کی سچی خدمت کرنا چاہتے
 ہیں تو آپ عبارت کی سادگی پر نظر رکھیں اور آسانی
 سے سمجھ میں آ جانے والے الفاظ کی بجائے خواہ وہ
 فارسی، عربی، سنسکرت یا انگریزی کی زبان کے ہوں
 غیر مانوس اور مشکل الفاظ استعمال نہ کریں۔ ایران کے
 آج کل کے مصنفین کے رجحان کے متعلق میرا کچھ کہنا
 اگر عبارت نہ سمجھا جائے تو میں یہ عرض کر دوں گا کہ یہ لوگ
 بعض مغربی زبانوں کے الفاظ بھی بلا تکلف اپنی سحر میں
 داخل کر لیتے ہیں اس سے زیادہ میں اس موضوع پر
 کچھ اور نہ کہوں گا۔

فرقہ وارانہ ذہنیت

اور

اُردو زبان

(اگست ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے ایک جلسہ

میں تقریر -)

ہندستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ بہر حال میں امید کرتا ہوں کہ اگر وہ لوگ جن کو اُردو سے دل چسپی ہو اور جو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ اپنی کوشش میں

کو تا ہی نہ کریں گے تو وہ باوجود ان حملوں کے جو عملی طور پر اس زبان پر اس وقت ہو رہے ہیں، اس کو نہ صرف محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ اس کی توسیع بھی کر سکیں گے۔ میں اور صوبجات کی نسبت تو اس وقت تذکرہ نہ کروں گا مگر یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ صوبجات متحدہ، بہار اور پنجاب میں یہ زبان عام طور پر کم از کم تعلیم یافتہ طبقوں میں تو اس وقت تک مروج رہی ہو اور یہی رشتہ باہمی اتفاق کا ہندو مسلمانوں کے درمیان رہا ہو۔ اگر اس شتہ کو اس وقت توڑ دیا گیا تو میرے خیال میں ہندو اور مسلمانوں میں جو اختلافات ملک کی بد نصیبی سے اس وقت پیدا ہو گئے ہیں، ان کو رفع کرنا قریب قریب غیر ممکن ہو جائے گا۔ میں اردو کے مسئلے کی اہمیت

بمقابلہ اور اسباب اختلاف کے بہت زیادہ سمجھتا ہوں
کیونکہ ہر ملک میں اندرونی خیالات اور جذبات کے
اظہار کرنے کا ذریعہ مشترک زبان ہی ہوتا ہے۔

یہ میں جانتا ہوں کہ اردو کے مٹانے کے لیے
کوئی احکام منجانب حکومت صادر نہیں ہوئے ہیں اور
اب بھی عدالتوں اور دفاتروں میں اس صوبہ میں اردو ہی
مستعمل ہوتی ہو لیکن عملی طور پر آج کل دیکھ رہا ہوں کہ
معمولی عام فہم الفاظ جن کا تھوڑا بہت بھی تعلق فارسی
یا عربی سے ہو وہ گفتگو اور تحریر سے خارج کیے جا رہے
ہیں اور ان کی بجائے سنسکرت کے الفاظ جن سے
کان آشنا نہیں ہیں، داخل کیے جا رہے ہیں۔ میں اس
سے انکار نہیں کرتا کہ جس طرح یہ اعتراض ہندوؤں پر

وارد ہوتا ہو۔ اسی طرح بعض مسلمانوں پر بھی ایک حد تک ضرور وارد ہو سکتا ہے یعنی اُردو کے بعض اخباروں اور رسالوں میں بجائے عام فہم الفاظ کے عربی اور فارسی کے مشکل اور ادق الفاظ استعمال کرنے کی کوشش ہوتی ہو۔ افسوس ہو کہ اس کشاکش میں وہ اُردو جس نے دہلی اور لکھنؤ میں نشوونما پائی اور جس کے گردیدہ تمام ہندو اور مسلمان تھے، تباہ ہوئی چلی جا رہی ہو۔ میں ان دلائل سے بخوبی واقف ہوں جو آج کل ایک نئی زبان کے پیدا کرنے کی تائید میں پیش کیے جاتے ہیں۔ کسی ملک میں زبان کی ترقی کا معیار دیہاتی معاویے پر قائم نہیں کیا جاتا۔ ہر ملک کی شہری اور دیہاتی زبان میں فرق ہوتا ہو۔ اگرچہ بنیاد ایک ہی ہوتی ہو۔ پس یہ

کہنا کہ ہم کو وہ زبان بولنی چاہیے جو دیہات میں سمجھی جاتی
 ہو، میرے خیال میں نہ صرف اُردو کو بلکہ ہندی کو بھی
 تباہ کرنا ہو۔ اگرچہ میں خود پسند کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن
 ہو عام فہم الفاظ استعمال کیے جائیں۔ لیکن یہ بھی جانتا
 ہوں کہ علمی اور ادبی زبان بازاری زبان سے مختلف
 ہوتی ہو اور علم و ادب، فلسفہ اور شعر و سخن کے لیے
 لازم ہو کہ زبان کا ذخیرہ بہت وافر ہو اور اس لیے
 میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ جو الفاظ صد ہا سال سے مقبول
 عام ہو گئے ہیں اُن کو اس وقت زبان سے خارج
 کیا جائے۔

چند دنوں کی بات ہو کہ ایک قانونی دستاویز
 میرے سامنے مشورہ کے واسطے رکھی گئی یہ آٹھ صفحے

کی دستاویز تھی مگر اس میں مشکل سے دس پندرہ الفاظ ایسے تھے جن کو میں سمجھ سکتا تھا۔ باقی الفاظ کے سمجھنے کے لیے مجھے ایک اور صاحب کی امداد کی ضرورت پڑی جو سنسکرت سے بخوبی واقف تھے۔ اس دستاویز میں جائیداد منقولہ و غیر منقولہ جیسے عام فہم الفاظ کے بجائے ”چل سمپتی“ اور ”اچل سمپتی“ درج تھے جن کو میں نے اپنے ۴۴ برس کے تجربے میں کسی قانونی دستاویز میں آج تک نہیں پڑھا تھا۔ ایک اور لفظ ہو کہ جس کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا۔ حزا پنچی کا لفظ ایک ایسا لفظ ہو جس کو صرف ضلع بجنور کے دیہاتی ہی نہیں بلکہ بلیا، بستی اور گورکھپور کے اضلاع کے دیہاتی بھی سمجھ جائیں گے۔ مگر اس کی بجائے آج کل

ایک طبقہ میں جو لفظ رائج کیا جا رہا ہو وہ ”کوشا دھیکش“ ہو چنانچہ میں نے اپنے چند دوستوں کے سامنے دو ملازموں کو جن میں سے ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص ہو اور جو دوسرہ ہندی اخبار پڑھتا ہو بلایا اور کہا کہ جاؤ ”کوشا دھیکش“ کو بلا لاؤ۔ یہ سن کر ملازم نے بار بار مجھ سے کہا کہ میں سمجھا نہیں کہ آپ کس کو بلانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اسی کے سامنے میں نے اپنے ایک عیسائی ملازم سے جو کہ گواکار رہنے والا ہو۔ کہا کہ جاؤ ”خز اپنچی“ کو بلا لاؤ۔ وہ یہ سنتے ہی فوراً میرے اس محرر کو بلا لایا جو رپڑ پیسے کا حساب رکھتا ہو۔ مجھے ”کوشا دھیکش“ کے لفظ پر اعتراض نہیں ہو۔ ممکن ہو کہ پچاس ساٹھ برس بعد یہ لفظ مقبول عام ہو جائے مگر یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت کو کون سی ایسی فوجی

یا لسانی ضرورت لاحق ہوئی ہو جس کی بنا پر ”خرانچی“
 جیسے عام فہم لفظ کو چھوڑ کر ”کوشا وھیکش“ کو رائج کیا جا رہا
 ہو؟ اب میں اس کے مقابلے میں ایک اور مثال دوں گا۔
 لفظ ”تھرمائیٹر“ اگرچہ انگریزی لفظ ہے لیکن ہر متوسط طبقہ
 کے گھر میں یہ لفظ سمجھا جاتا ہے، مگر میں نے اپنے ایک سالان
 دوست کو اس کے بجائے ”آلہ مقیاس الحرات“ کہتے
 ہوئے سنا۔ ممکن ہے یہ لفظ عرب میں اس وقت رائج ہو
 لیکن ہندستان میں تو میں اسے اردو کہنے کے لیے تیار
 نہیں ہوں۔ جیسے کہ ہم نے ہزار ہا الفاظ عربی و فارسی سنسکرت
 اور ہندی کے اردو میں داخل کر لیے ہیں اسی طرح
 انگریزی کے الفاظ بھی ہماری زبان میں داخل ہو گئے
 ہیں۔ اور وہ عام فہم ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس صوبے میں

کلکٹر۔ کمشنر۔ جج۔ ہائی کورٹ۔ ریلوے اسٹیشن۔ بانیسکل۔
 موٹر ایسے الفاظ ہیں جو ہر شخص سمجھتا ہو اور جو ہماری زبان
 میں جذب ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے الفاظ کا
 ترجمہ عربی، فارسی، سنسکرت یا ہندی کے الفاظ میں کرنا
 زبان کے ساتھ بدسلوکی کرنا ہو اور اس کی روز افزوں ترقی
 اور وسعت کو روکنا ہو۔

مجھے اس پر اعتراض نہیں ہو کہ بندہ ہندی کی نظر
 متوجہ ہو رہے ہیں اور نہ اس پر اعتراض ہو کہ مسلمان
 عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ مگر اس پر ضرور اعتراض ہو کہ اس
 زبان پر جس کی بنیاد ہندو اور مسلمان دونوں نے ڈالی
 ہو۔ اور جس کی ترقی میں دونوں نے کچھلے، زمانے میں
 کوشش کی ہو۔ اور جس کو میں مشترکہ زبان ہندو اور مسلمانوں

کی سمجھتا ہوں۔ اس کو ہندو اور مسلمان اپنی تنگ نظری اور تنگ خیالی کی وجہ سے تباہ کریں۔ میرے خیال میں اس میں ہندوؤں کی غرض اس وجہ سے کہ ان کی تعداد زیادہ ہے، زیادہ ذمہ داری ہو کہ وہ اپنی طرف سے علیٰ طور پر اُردو کو کہ جس کو میں اپنے طور پر مشترکہ زبان سمجھتا ہوں، خراب نہ کریں۔ اس زبان کا تعلق اس تہذیب سے ہے جس کو نہ میں اسلامی تہذیب کہتا ہوں اور نہ ہندو تہذیب، بلکہ وہ ہندو مسلمانوں کی ایک مشترکہ تہذیب ہے جو مغلوں کے وقت میں پیدا ہوئی۔ اس تہذیب نے ہندو مسلمانوں کے درمیان ہم مذاقی کا تطف پیدا کر دیا، جو اب تک باوجود دیگر انقلابات کے قائم ہے۔ اس میں یہ بات نہ بھولنا چاہیے کہ اُردو کا یہ مسئلہ محض زبان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ مجموعی طور پر

آؤر درحقیقت تہذیب کا مسئلہ ہے۔ میں اس لفظ تہذیب کو اس کے وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ پس اکابر ان قوم کا فرض ہے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ اگر ہم نے یہ تہذیب مٹا دی تو ہم اس کے بجائے کون سی تہذیب قائم کریں گے ؟



کشمیر اور اردو زبان

[بزمِ اردو سری نگر کے زیرِ اہتمام ۲۵ اگست

۱۹۳۹ء کو ایک مشاعرہ سر بیچ بہادر سپرد کی

صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ یہ تقریر سر سپرد نے

اس موقع پر فرمائی۔]

حضرات! آپ کی بزمِ ادب کے اس جلسے کی
صدارت کا جواہر از آپ نے مجھے بخشا ہی اس کا تہ دل
سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں شاعر
ہوں، البتہ یہ بات ضرور ہو اور میں اس کا اقرار کرنے کے

لیے تیار ہوں کہ مجھے اُردو فارسی سے دل چسپی رہی ہو
 اور ہو۔ گو میں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ میں ہر کلام سمجھتا
 ہوں۔ مجھے سخت افسوس کے ساتھ اس امر کا ذکر کرنا پڑتا
 ہو کہ جہاں ہندستان میں کئی اور شورشیں بپا ہیں وہاں زبان
 کا مسئلہ بھی بیچ میں گھسیٹ لیا گیا ہو۔ مجھے یہ کہنے میں
 مطلق تاثر نہیں کہ میں اُردو زبان کا حامی ہوں اور
 اس پرانہ سالی میں بھی اگر میں اُردو زبان کی کوئی خدمت
 کر سکوں تو میں اپنے لیے سعادت سمجھوں گا۔ اگر کوئی زبان
 ایسی ہو جو پشاور سے لے کر سی۔ پی اور بمبئی اور مدراس
 کے بعض علاقوں میں سمجھی جاسکتی ہو اور جس کی بدولت
 ہمیں سارے ملک کے سفر میں آسانی ہو سکتی ہو تو وہ اُردو ہے۔
 اگر مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اُردو ان کی ایجاد اور

ان کی ساختہ پر داختہ ہو تو مجھے اس سے قطعاً انکار ہو
 اور اگر ہندو ایسا دعویٰ کریں تو وہ بھی غلط۔ اس کے
 بنانے اور ترقی دینے میں دونوں کا برابر حصہ ہو۔ آج
 کل ہندو اُردو سے متنفر ہو رہے ہیں اور مسلمان ہندی
 سے۔ اس لیے بعض اصحاب ایک نئی زبان ”ہندستانی“
 کے رواج دینے پر تلمے ہوئے ہیں۔ میں نے اس کی اکثر
 شکایت کی ہو اور اب بھی اس کا اظہار کرتا ہوں کہ
 اس کے رواج دینے میں ڈاکٹر عبدالحق نے
 بھی کچھ حصہ لیا ہو۔ ”ہندستانی“ کوئی زبان نہیں۔ اس کا
 کچھ مطلب نہیں۔ تامل، تیلگو، بنگلہ، گجراتی اور دوسری
 زبانیں بھی ہندستانی کہی جاسکتی ہیں۔ اگر ہندستانی سے
 مراد وہ زبان ہو جو تملر، سودا، غالب اور آتش و ناسخ

نے لکھی ہو اور جو پچاس برس پہلے یا اس کے بعد دہلی میں
 بولی جاتی تھی اور لکھنؤ میں رائج ہو تو ہمیں اس کے ماننے
 میں کوئی تامل نہیں۔ میری رائے میں صحیح اور فصیح اُردو
 وہ ہو جو ڈاکٹر عبدالحق اپنے رسالہ 'اُردو' میں لکھتے
 ہیں۔ وہ زبان جو دہلی اور لکھنؤ کے بازاروں میں بولی جاتی
 ہو اور جس کا رواج تعلیم یافتہ طبقے میں ہو چکا ہو اس میں
 سینکڑوں عربی، فارسی نیز سنسکرت کے لفظ شامل ہیں عوام
 کو اس کا علم بھی نہیں کہ وہ عربی فارسی کے ہیں یا سنسکرت
 کے۔ اس لیے اب وہ غیر زبان کے لفظ نہیں رہے
 بلکہ اُردو کے ہو گئے ہیں۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ
 یہ الفاظ جو مدت دراز کے استعمال سے اُردو میں جذب
 ہو گئے ہیں اور اس کا جز بن گئے ہیں زبان سے

خارج کر دیے جائیں۔ اور ان کی بجائے ایسے لفظ داخل کیے جائیں جو سراسر غیر مانوس ہیں۔ البتہ یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ عربی، فارسی، سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ اُردو زبان میں بلاوجہ نہ ٹھونسے جائیں۔ اس سے زبان کی فصاحت میں فرق آتا ہے۔

مجھے اس موقع پر اپنی الہ آباد کی ایک تقریر کے الفاظ دہرانے پڑتے ہیں ”اُردو زبان ہندو مسلمانوں کا ایک ایسا مشترکہ و مقدس ترکہ ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے۔ اس لیے مسلمان اگر یہ دعویٰ کریں کہ یہ اُن کی زبان ہو تو یہ دعویٰ ہرگز قابل قبول نہیں۔ یہ ایک مشترکہ ترکہ ہے جو صدیوں سے ہمارے حصے میں آیا ہے۔ یہ ہماری تہذیب کا خزانہ ہے۔ بحیثیت ہندو ہونے کے مجھے یہ کہنے میں کچھ تامل

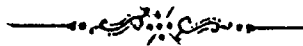
ہیں کہ میری مادری زبان اُردو ہے۔ اور ہندوستانی کا کیا مطلب ہے؟ میں ڈاکٹر عبدالحق سے پھر سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس کا مطلب سمجھائیں۔ یہی زبان جسے ہم اُردو کہتے ہیں تہنا وسیلہ ہے جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جاسکتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اس زبان کو مٹانے اور اس رشتہ کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔

کشمیر میں شعر و سخن کا ذوق ایک زمانے سے چلا آ رہا ہے۔ کشمیر نے بڑے بڑے اعلیٰ پایہ کے شاعر پیدا کیے ہیں جن میں غنی کشمیری ایک ممتاز اور شاندار مثال ہے۔ ایک بار میں کیمبرج میں پروفیسر براؤن کا جو فارسی

کے بہت بڑے فاضل تھے، مہمان تھا۔ ان کی صحبت ادبی اور علمی لحاظ سے بہت پُر لطف ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ باتوں باتوں میں میں نے اُن سے دریافت کیا کہ ہندستان کے فارسی شعرا میں سے کس کا کلام مقبول ہوا اور اہل ایران ہمارے کن شاعروں کو شاعر مانتے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ایک تو خسرو کو اور دوسرے عینی کشمیری کو۔ اس لیے اگر کشمیر میں شعر و سخن کا چرچا نہ ہو تو کہاں ہو سکتا ہو؟ کوئی شخص خواہ کتنا ہی خشک کیوں نہ ہو۔ اگر وہ نشاط باغ، شالامار یا چشمہ شاہی میں (جہاں میں دوہینے سے مقیم ہوں) جائے اور وہاں کی سپر کرے تو ممکن نہیں کہ اس کے دل میں شعر سننے یا شعر گوئی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ ہندستان میں اگر

کوئی مقام ایسا ہو جو شعرا کے لیے القا اور الہام کا حکم رکھتا ہو تو وہ کشمیر ہی ہو۔

مجھے یہ سُن کر بڑی مسرت ہوئی کہ بہت سے اعلیٰ پایہ کے شعرا اس مجلس میں تشریف لائے ہیں جن کا کلام سُن کر آپ محظوظ ہوں گے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شعرا کا کلام سُننے آئے ہیں۔ میری تقریر سننے نہیں آئے ہیں۔ لہذا میں اپنی تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کی کارروائی شروع کرتا ہوں۔



پیامِ موقعِ کل ہند اردو کانفرنس

دہلی (دسمبر ۱۹۳۹ء)

۲۴ دسمبر ۱۹۳۹ء

۱۹۔ البرٹ روڈ۔ الہ آباد

محمد امجد علی مکرچی ڈاکٹر عبدالحق صاحب

تسلیم دینا۔ اگرچہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس موقع پر جلسے میں شریک ہوں لیکن پچھلے تین چار روز سے میری طبیعت پھر ناساز ہو گئی ہے اور مجھے خوف ہے کہ ریل کے سفر سے زیادہ خراب نہ ہو جائے۔ لہذا بحالتِ مجبور ہی میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ کل شب کو ڈاکٹر صدیقی صاحب بھی تشریف لائے تھے میں نے اُن

سے زبانی بھی عوض کر دیا ہو کہ میری طرف سے معذرت
کر دیں۔

اگرچہ چھٹیں جلسہ میں موجود نہ ہوں گا لیکن میں آپ
کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے مقاصد اور اغراض سے
بہمہ وجوہ وابستہ ہوں اور پوری ہمدردی رکھتا ہوں۔ آپ
کا ہم نوا اور ہم آہنگ ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے
مقاصد میں پورے طور پر کامیاب ہوں گے۔ میں اس
مسئلہ زبان کو کسی فرقہ دارانہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا
ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو تنازعہ اس وقت زبان کے
مسئلہ کے متعلق ہندوستان میں پیدا ہو گیا ہو اس کی
اہمیت اور تنازعات سے بہت زیادہ ہو۔ کیونکہ اگر یہ
زبان جس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو

اور مسلمان دونوں نے حصہ لیا ہی، تباہ ہو گئی
 تو وہ تہذیب اور طرز زندگی بھی جس کا یہ ظاہری لباس ہو
 تباہ ہو جائے گی اور کم از کم شمالی ہندستان میں تو ہم کو
 بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک مؤرخ نے راجہ
 ٹوڈرل کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھیں کے حکم سے
 حسابات سلطنت فارسی میں لکھے جانے لگے اور ہندوؤں
 نے عام طور پر فارسی کا پڑھنا شروع کیا جس کا آخر کار نتیجہ
 یہ ہوا کہ شمالی ہندستان میں ایک نئی زبان یعنی اُردو
 پیدا ہوئی جس کو اگر ہندو قبول نہیں کرتے تو ہرگز پیدا
 نہیں ہو سکتی تھی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ غیر ممکن تھا کہ تمام ہندو
 فارسی پڑھ جاتے اور یہ بھی اسی قدر غیر ممکن تھا کہ اس
 زمانے میں تمام مسلمان ہندی پڑھ جاتے۔ چونکہ دونوں کو

اسی ملک میں رہنا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ دنیا کے کاروبار لازمی تھے لہذا ضروریات وقت نے دونوں کو اس پر مجبور کیا کہ ایسی زبان مشترکہ پیدا کی جائے کہ ایک دوسرے کے خیالات کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی وقعت اور احترام کر سکیں یہی وجہ ہو کہ اردو میں ہندی، سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی اس قدر آمیزش ہو۔ رفتہ رفتہ اسی زبان کے استادوں نے اس زبان کو اس خوبی کے ساتھ مانجھا کہ اس کو بذاتِ خود ایک مشترکہ زبان ہونے کا وقار حاصل ہو گیا۔ اور اس کو مشترکہ زبان کہنے میں نہ ہندو اور نہ مسلمان اپنی بے عزتی سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہمارے ملک میں ایک مشترکہ تہذیب پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کم از کم شہروں میں تو

تبادلہ خیالات میں کسی قسم کی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ دہلی - آگرہ - روہتکھنڈ اور پنجاب کے اطراف میں تو اس زبان کو دیہات میں بھی دخل ہو گیا اور دیہاتی زبان میں بھی ہزار ہا الفاظ داخل ہو گئے جن کو ہم یہی سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک کے الفاظ ہیں مگر اب دھارا دوسری طرف بہ رہا ہے اور اب یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ چُن چُن کر وہ الفاظ جو مقبول عام ہو گئے ہیں ہماری زبان سے خارج کیے جائیں اور ایک نئی زبان پیدا کی جائے جو کہ تمام ملک پر حاوی ہو۔ میں آپ سے صحیح عرض کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوشش کیوں اس وقت کی جا رہی ہے۔ ایسی کون سی ضرورت لاحق ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سے ہم اس زبان کو جو کہ

دوسو ڈھائی سو برس سے شمالی ہندستان میں رائج ہو گئی
 ہو اس طریقہ سے ختم کریں اور اس زبان کے ساتھ اس
 ہندوستان کو بھی ختم کریں جس میں کہ یگانگت کے خیالات
 پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا
 کہ حامیان اُردو، ہندی یا کسی اور زبان پر حملہ کریں مگر
 میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی اُردو پر حملہ نہ
 کریں۔ اُردو اس وقت میرے خیال میں معرض خطر میں
 ہو اور اس وقت خطرہ زیادہ اس وجہ سے ہو کہ آپس
 کی جنگ و جدل کی وجہ سے ہندو بھی اس کو بگاڑ رہے
 ہیں اور مسلمان بھی۔ اگر ہندوؤں کی طرف سے یہ کشش
 ہوتی ہو کہ معمولی الفاظ فارسی یا عربی کے جو ہماری
 زبان میں جذب ہو گئے ہیں بحال دینے جائیں تو

مسلمانوں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہو کہ بجائے
ہندی کے معمولی الفاظ کے مشکل سے مشکل الفاظ
عربی یا فارسی کے جو عام فہم نہیں ہیں، استعمال کیے
جائیں۔ اُردو کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی بڑا سلوک
نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہو کہ نحن
ترقی اُردو اس معاملہ میں پیش قدمی کرے اور ایک معیار
زبان کا قائم کر کے اس بات پر اصرار کرے کہ جو کتابیں
یا مراسلے یا اخبارات اُردو میں لکھے جائیں وہ اسی
زبان میں ہوں جو کہ عام فہم ہو۔ تاکہ اس زبان کی
روز افزوں ترقی ہو اور اس کو وسعت حاصل ہو۔ یہ
ضرور ہو کہ اصطلاحی الفاظ کا ذخیرہ ہمارے یہاں کافی
نہیں ہو اور ہم کو دیگر زبانوں سے جس میں کہیں انگریزی

کو بھی شامل کرتا ہوں، ایسے الفاظ لینے پڑیں گے۔ ادب کا دائرہ اب ہنایت وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرے خیال میں ہماری انجمن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسی کتابیں مستند اردو زبان میں شائع کرے کہ جس کی بدولت ہمارے نوجوانوں کی تعلیم شروع سے آخر تک کافی طور پر بہتر ہو جائے۔ مثلاً ہندوستان کی تاریخ میں کوئی وجہ نہیں دکھتا کہ ہمارے ادیب ہر حصہ تاریخ ہندوستان کے اوپر ہندو زمانے سے لے کر انگریزی زمانے تک عالمانہ کتاب نہ لکھیں۔ ادب میں تنگ نظری و تعصب کی گنجائش نہیں ہے۔ ادب کو کسی ذاتی اعتقاد یا تعصب سے تعلق نہیں ہے۔ وہ ادیب ادیب نہیں جس میں منصف مزاجی نہ ہو۔ لہذا میں ہنایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا

کہ انجمن ترقی اُردو کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرے۔ اور جس انجمن کا روح رواں ایسا شخص ہو جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق۔ اُس سے ایسی امید کرنا ہمارے لیے بیجا نہ ہوگا۔ آخر میں دُعا کرتا ہوں کہ آپ کا جلسہ کامیاب ہو اور آپ ایسی تجاویز منظور فرمائیں کہ جو عملی طور پر مفید ثابت ہوں۔

نیاز مند

تیج بہادر سپر



اہل کشمیر سے سرسپرو کا خطاب

[سری پرتاب کالج، سری نگر (کشمیر) کے
جلسہ تقسیم اسناد مسئلہ ۱۹ء کی صدارت رائٹ آنریبل ڈاکٹر
سر تیج بہادر سپرو پنی سی، کے سی۔ ایس۔ آئی، ایم
لے، ایل۔ ایل۔ ڈی (الہ آباد) ڈی۔ سی۔ ال
(آکسفورڈ) ڈی۔ لٹ (بنارس) ال۔ ال۔ ڈی
(عثمانیہ) نے فرمائی تھی۔ ہم خطبہ صدارت کا وہ
اقتباس پیش کرتے ہیں جو ہندیب و تمدن اور
زبان سے متعلق ہو۔]

کشمیر ہمیشہ ہمیشہ سے دوسرے ملک والوں کے لیے
بہت ہی دل کش اور دل فریب خطہ رہا ہو لیکن شاید
کم لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ ان بیش بہا سٹالٹ کے علاوہ

جو قدرت نے اس ملک کو برف پوشش پہاڑیوں، خوش
 خرام ندیوں، خاموش جھیلوں، پرشکوہ باغوں، مٹھلیں
 سبزہ زاروں اور لذیذ میوؤں کی شکل میں بڑی فیاضی
 سے کام لے کر عطا کیے ہیں، کشمیریوں نے ہندوؤں
 کے عہد میں بھی اور مسلمانوں کے عہد میں بھی ہندوستانی
 ہتذیب اور فلسفہ کی ترقی میں اتنا حصہ لیا ہے کہ اس پر
 ان کی موجودہ نسلیں جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔ ہتذیب تمدن
 کا ذکر کرتے وقت یہ تذکرہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہے
 کہ ان تمام انقلابات اور کشمکش کے باوجود جن سے
 کشمیر کی تاریخ بھری پڑی ہے، ایک بات سب سے
 زیادہ نمایاں ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے تمام دوسرے
 حصوں سے زیادہ کشمیر حقیقی معنوں میں ہندوؤں اور

مسلمانوں کی تہذیب کا سنگم بنا رہا۔

گزشتہ زمانے میں کشمیری مسلمانوں نے فلسفہ
شاعری اور آرٹ کے میدانوں میں جو جو ہر دکھائے اُن
سے کون واقف نہیں۔ کاش ان بزرگوں کی اولاد میں
کوئی ایسا بھی ہوتا جو ان کارناموں کی مسلسل اور صحیح تاریخ
دُنیا کے سامنے پیش کر سکتا۔ یہ شرف ایک انگریز اہل قلم
کو ہی ملنا تھا کہ اس نے شاہ ہمدان کے فلسفے سے دُنیا
کو کسی قدر روشناس کرایا۔ مگر ہم کو بھولنا نہ چاہیے
کہ شیخ نور الدین کی شاعری اور اس کا فلسفہ کشمیر کے
ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ کوئی بیس
برس ہوئے کہ مین کیمبرج میں پروفیسر ایڈورڈ براؤن
نے ملاحظہ جن کی فارسی دانی مسلم ہے۔ ان کی زبان

سے یہ سُن کر مجھے بڑا غم محسوس ہوا کہ فارسی کے ان
چند ہندستانی شاعروں میں جن کی شہرت و مقبولیت
ایران تک پہنچی ہو۔ غنی کشمیری بھی ہو۔ مغلوں کے بنائے
ہوئے شاہی باغ، جسے دیکھنے کے لیے آج بھی ہزاروں
آدمی باہر سے آتے ہیں اس کا شاہد ہو کہ جہانگیر کو کشمیر
سے کتنی الفت تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی
کہ ہمارا جہ بہادر کی حکومت ان باغوں کی دیکھ بھال
بڑے اہتمام سے کرتی ہو۔ آرٹ کے میدان میں
بھی ہندوستان بھر میں کشمیر کا درجہ سب سے بلند ہو۔
اپنے زمانے پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یاد آتا ہو کہ اس
فلسفی شاعر کے آباؤ اجداد بھی جو حال ہی میں ہم سے
جدا ہوا، کشمیر ہی کے رہنے والے تھے۔ میری مُراوی

مرحوم سر محمد اقبال سے ہے۔

اب میں کچھ خاص کر نوجوان پنڈتوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ اس تخصیص کی وجہ میری یہ آرزو ہے کہ ان نوجوانوں کے دلوں میں یہ ذہن نشین ہو جائے کہ ان کے آباؤ اجداد اور ان کے ہم عصر جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اس مشترکہ تہذیب کے کس درجہ مرہون منت ہیں۔ کتنے بڑے افسوس کی بات ہوگی اگر اس زمانے میں جبکہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے والی باتیں کم اور نفاق بڑھانے والی باتیں زیادہ ہو گئی ہیں۔ اُسے بھلا دیا جائے کہ اُن بزرگوں نے اس مشترکہ تہذیب سے دامن بچانے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ کشمیر سے جو شخص دُرا بھی

واقف ہو وہ کشمیری پنڈتوں کی ان کوششوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا جو انھوں نے فلسفہ، شاعری اور تمدن کو ترقی دینے میں کیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر نے کم سے کم دو خواتین ایسی پیدا کی ہیں جن کی شاعری اور جن کا فلسفہ اب بھی ہمارے لیے دلاویز اور باعث فخر ہو سکتا ہے۔ یہ بالکل درست ہے کہ ہندوؤں نے اپنا فلسفہ اور اپنا تمدن محفوظ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے نو واردوں اور دوسرے مذہب کے پیروؤں کے تمدن کو نظر انداز نہ کیا۔ یہ کسے نہیں معلوم کہ شمالی ہندستان میں یہ کشمیری پنڈت ہی تھے جنہوں نے اپنے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہترین چیزیں یکجا کر لیں۔ یہ کشمیری پنڈتوں کی فارسی دانی

ہی کا طفیل تھا کہ انھیں مغل درباروں میں امراء کے منصب
 ملے۔ میرے اس قول کی تصدیق ان بزرگوں کے سوانح
 حیات سے ہوتی ہو جو حالات سے مجبور ہو کر کشمیر سے ہجرت
 کر کے ملک کے اس حصے میں چلے گئے جو اب برطانوی
 ہندوستان کہلاتا ہے۔ یہ ایک وسیع تر دنیا میں مقابلے کے
 لیے نکلے تھے۔ ایک مضبوط کردار، ذہانت اور موقعہ شناسی
 کی زبردست صلاحیت ان کے ہر کام میں تھی اور جب تک
 دہلی اور لکھنؤ کی درباری زبان فارسی رہی انھوں نے
 کالستھوں کی طرح بڑے بڑے سرکاری عہدے حاصل
 کیے۔ لیکن کشمیری پنڈتوں کی شہرت صرف اسی وجہ
 سے نہیں ہو کہ انھوں نے دہلی، لاہور اور لکھنؤ میں
 بڑے بڑے عہدے سنبھالے ہیں بلکہ زورِ قلم اور

علم مجلس کے اعتبار سے بھی کشمیری پنڈتوں نے نام پیدا کیا اور مسلمان حکمرانوں نے بھی اسے تسلیم کیا جب فارسی کی جگہ اردو نے لی، تب بھی کشمیری پنڈت بہت جلد نئی فضا میں نمایاں ہو گئے۔ اگر وقت اجازت دے تو میں ان بہت سے کشمیری پنڈتوں کے نام گناؤں جو فارسی اور اردو اہل قلم کی حیثیت سے برطانوی ہند میں سر بلند رہے ہیں۔ عہد مغلیہ کے رائے ریاں اندرام مخلص کے تعارف کی ضرورت نہیں، جہنوں نے نہ صرف اعلیٰ مراتب حاصل کیے بلکہ خاندان مغلیہ کی ایک گراں مایہ تاریخ لکھی ہے۔ گلزار نسیم کے زندہ جاوید مصنف پنڈت دیاندر نسیم کا نام کس نے نہ سنا ہوگا۔ ہندوستان میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو میر سے

مرحوم دوست پنڈت برج نرائن چکبست کی شاعری کا ستر
 نہ ہو، اور اس سے کون اکھا کر سکتا ہو کہ اُردو ناول کے
 موجدوں میں ایک نام رتن ناتھ دسرشار کا بھی ہو جو کشمیری
 پنڈت تھے۔ ایسی ہی ہزاروں مثالیں ہیں۔ مدیرین اور
 سیاحوں کی فہرست میں پنڈت (بعد کو مرزا) موہن لال
 کا نام خاص طور پر آتا ہو۔ ججوں میں پنڈت شمشو ناتھ تھے
 جو پہلے ہندستانی ہیں جن کو کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔
 . وکیلوں اور لیڈروں میں پنڈت اچودھیا ناتھ، پنڈت
 شمشو ناتھ (آبھانی) پنڈت بشن نرائن درآبھانی، پنڈت
 پرچھی ناتھ چاک آبھانی، جگت نرائن مٹا، شیو نرائن شیم،
 اور سب سے آخر میں لیکن کسی سے کم نہیں پنڈت موٹی
 لال ہنرو آبھانی کے نام کافی مشہور ہیں اور بہت سے

ریخت سنگھ کی سلطنت میں اور موجودہ ریاستوں کے
 نظم ملک میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ کشمیر کے نوجوان
 پنڈتوں کے سامنے میں فی الحقیقت اس سے بہتر مثالیں
 پیش نہیں کر سکتا لیکن یہ امید رکھتا ہوں اور اس کے لیے
 دست بدعا ہوں کہ ان مثالوں کو آپ نوجوان نہ صرف
 ذاتی مقاصد کے حصول میں پیش نظر رکھیں بلکہ ان کی
 بدولت ملک و وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کر سکیں۔
 اب میں ایک ذاتی استدعا آپ لوگوں سے کرتا ہوں
 کہ ہندو ہونے کی حیثیت سے آپ نہ اپنے فلسفے کو
 نظر انداز کیجیے اور نہ تہذیب و تمدن کے اس گرانہا
 خزانے کو جو آپ کو ورثے میں ملا ہو لیکن فارسی اور
 اردو سیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھیے۔ یہ اب بھی کشمیر

میں آپ کے بہت کام آئے گا خواہ آپ علم اور تمدن
 کو افادہٴ نقطہٴ نظر ہی سے دیکھیں۔ اور یہ میرے لیے بڑے
 افسوس کا باعث ہوگا اگر محض فرقہ وارانہ ذہنیت کی بدولت
 آپ نے اپنے اجداد کی مثالیں پس پشت ڈال دیں،
 اور اُردو کو بدیسی زبان سمجھنے لگے۔ یقیناً مانیہ تمدنی جینا
 سیاسی اتحاد کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں
 اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہوگی اگر ہندی کو ترقی دینے
 کی جائز خواہش کے ساتھ آپ نے اپنے پر یہ لازم کر لیا
 کہ اُردو ڈھنے ساتھ بے دفاعی کی جائے جو ہندوؤں
 اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی سب سے مضبوط کڑی ہے۔

